© rasailojaraid.com

ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

انسان کے ہاتھوں نے اپنے مغز کی باتوں کو کاغذوں پر اوتارا، پھیلایا، اتنا پھیلایا یا پھیلاتے رہیں گے کہ انطلانطق کے ایک ساحل کو دوسرے ساحل سے ملایا جا سکتا ہے، کتنی کتابیں، کتنے رسالے کتنے اخبارات، کہ زمین کے کرّہ کو اس میں اب ہم لپیٹ سکتے ہیں، تہوں پر تہیں چڑھا سکتے ہیں اور یقیناً ہماری اور ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں کی یہ کمائی پھر بھی بچ جائے گی آخر ان سیاہیوں کو کون تول سکتا ہے، کاغذ کے اُن دستوں کو کون ناپ سکتا ہے، لکڑی یا لوہے کے اُن ٹکڑوں یا قلموں کو کون گن سکتا ہے جو اب تک اس راہ میں خرچ ہوئے یا آئندہ ہونے والے ہیں

لیکن

جس نے لکھا اور جس کے لئے لکھا گیا، اُن میں کون ہے جس نے یقین کے ساتھ اُن کو لکھا یا یقین کے ساتھ اُس کو پڑھا۔ برنارڈ شا کے تمثیلی حکایات ہوں یا شرلاک ہومز کے اختراعی روایات، ہوشربا کی داستانیں ہوں یا پریم چند اور سدرشن کے افسانے۔ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور ہم سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کیا لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں اس یقین کے سوا اپنے اندر کوئی اور یقین رکھتے ہیں؟ مرزا داغ کا قدم اگر سچ کی چٹانوں پر نہ تھا تو تم سے کس نے کہا کہ مسٹر شکسپیر کی تمثیلیں بھی ہوا کے سوا کسی اور چیز کی دیوار پر قائم تھیں؟ مؤرخ خود بھی جانتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے

© rasailojaraid.com

قیاس اور تخمینہ کے سہارے پر لکھا ہے اور تاریخ کے پڑھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اٹکل سے نکالے ہوئے نتیجوں کے سوا تاریخ کی کتابوں میں اور کچھ نہ ملے گا۔

یہ تو اُن باتوں اور زبان کی درازیوں کا حال ہے جنہیں لکھکر، ہم نے علم کا لقب عطا کیا ہے، لیکن جو واقعی علوم ہیں اور جن کے نتائج پر زندگی کے بیشمار کاروبار چل رہے ہیں، بلاشبہ نتائج تو صحیح ہیں لیکن ان نتائج کے لئے جن قوانین کو ہمارے دماغ نے اصول کی شکل میں پیش کرنا چاہا ہے تم نہیں جانتے، لیکن اُصول کے جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے بھی اُن کو اس حد تک نہیں جانا ہے اور شاید جان بھی نہیں سکتے جس کے بعد علم پر یقین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس عینی اور غیر فلسفی دماغ کو کون فلسفی کہہ سکتا ہے جو اپنی فلسفیانہ کوششوں میں "شک" اور "ارتیاب" "تذبذب" اور "دبدبا" کے خارستانوں تک نہ پہنچ گیا ہو۔ "شک" ہی کے کانٹے اور "تذبذب" ہی کے انگارے فلسفیانہ محنت کی سب سے بڑی اور یقیناً سب سے بڑی قیمتی مزدوری ہیں

سائنس اور ریاضی کے نتائج سے کسے انکار ہے کون کہتا ہے کہ دن نہیں ہوتا اور رات نہیں آتی، فصلیں نہیں بدلتیں، موسم نہیں پلٹتے، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے انسٹائن سے پوچھو کہ جن اُصولوں سے ان نتائج کو مختلف زبانوں کے مختلف دماغوں نے وابستہ کیا ہے کیا اس کی وابستگی پر انہیں یقین تھا یا اُس پر یقین کے لفظ کے استعمال کا کوئی حق رکھتا ہے۔

سنتے ہیں کہتی ہیں آدم زاد کی مذہبی جماعتوں میں غل ہے کہ ان کے پاس یقین ہے۔ نصرانی سمجھتے ہیں کہ انجیل یقین ہے، یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ توراۃ میں اطمینان ہے، ہندوؤں سے سنتا ہوں کہ وید میں یقین ہے، علمی ڈگمگاہٹ کے لئے گیتا میں قرار ہے کہ یہ علام الغیوب کی کتاب ہیں جن میں انھیں بھی بتاتا ہے جو گزر چکے اور اُن کو بھی جو گزر رہے ہیں اور انھیں بھی جو گزرنے والے ہیں وہ بھی اس کے سامنے ہیں جو ہمارے سامنے ہیں اور وہ بھی جو ہمارے سامنے نہیں ہیں، حال جس کا

© rasailojaraid.com

علم اتنا محیط ہو، کیا شک ہے کہ اسی کی کتاب، اسی کی تصنیف کہہ سکتی ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے مگر کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ ان قوموں کے پاس اب وہ کتاب باقی رہ گئی ہے جسے خدا کے نمائندوں اور رسولوں نے انھیں سپرد کی تھیں؟ وید ہو یا آوستا، تورات ہو یا انجیل، تعلیمات بودھ یا تلقینات کنفوشس، کیا کسی کے پاس وہ چیز اپنی اصلی شکل میں باقی رہ گئی ہے جس شکل میں انھیں ملی تھیں۔ اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی اس پکار سے کانوں میں انگلیاں وہ کیوں ٹھونستے ہیں جو محض اپنی قومی اور ملی انانیت یا خودی کے نشہ میں اس حادثہ کو نہیں دیکھنا یا سننا چاہتے ہیں جو خود ان کے ہاتھوں یا ان کے پیشواؤں کے ہاتھوں سے ان کی کتابوں پر گزر گیا۔

خدا کی باتوں میں انسانی خواہشوں کی خمیر مل گئی ہے، اب اس کو جدا کرنے کی کس میں طاقت ہے؟

پس اب

برٹش میوزیم کی طویل الذیل المماریوں، پیرس اور نیویارک کی عظیم الشان لائبریریوں، برلن اور ویانا کے لق ودق کتب خانوں، ہاں مشرق و مغرب کے سارے کتابی ذخیروں کے درمیان زمین کے چہرے پر اگر

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

کا دعوےٰ کسی کتاب کے متعلق کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف وہی کتاب ہے جو شاید ہر مسلمان کے "گھر" میں ہے لیکن غالباً اب کسی کے "اندر" نہیں إلّا ما شاء اللہ۔

© rasailojaraid.com